جمیل جالبی

ذرا تصور تو کیجیے ۔۔۔ دو کمروں کے ماڈرن کوارٹر میں چوبیس افراد کا کنبہ! سامان کمروں اور برآمدے میں سے اُبل کر باہر سڑک پر آ گیا تھا۔ پاس پڑوس والے ہنستے تھے کہ یہ کباڑیے کہاں سے آ گئے۔ اسی کوارٹر کے برآمدے کے ایک گوشے میں ساقی کا دفتر بھی قائم کر دیا گیا تھا۔ دن بھر تو یہ جگہ دفتر بنی رہتی مگر رات کو اس میں بھی سونے والے پڑ رہتے۔ یہ کوارٹر اِس احتیاط سے بنائے گئے تھے اِن میں پانی اور بجلی کا گزر نہ ہونے پائے۔ باہر کہیں کہیں نل لگا دیئے گئے تھے کہ پَو پھٹنے سے پہلے، اگر کسی کا جی چاہے تو پانی بھرے۔ رات کو ریڑھی والے کے چراغ کی طرح لالٹین جلا کر اپنا جی خوش کر لو۔ ہنسی کی ہنسی، دُکھ کا دُکھ۔ اتنی شدید آبادی ہونے پر بھی ذرا چہل پہل نہیں تھی۔ دن بھر ہُو کا عالم اور شام ہوتے ہی مری مُری پھیل جاتی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں، سب اپنا اپنا آپا تنگ رہے تھے۔ دراصل جھٹکا ہی ایسا لگا تھا کہ لوگ اب تک اس سے سنبھل نہ سکے تھے۔ بھانت بھانت کا آدمی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلا آ رہا تھا۔ اسی ریلے میں ہم بھی یہاں گرتے پڑتے پہونچ گئے تھے۔ مگر عجب معاملہ تھا کہ جتنے اُدھر سے آئے تھے اُن میں لکھ پتی سے کم کوئی نہیں تھا۔ حد یہ کہ جنہیں میں اچھی طرح جانتا تھا وہ بھی اپنے آپ کو دلّی کے رؤسا میں سے بتاتے تھے اور ستم یہ کہ اپنے تموّل کی شہادت مجھ سے دِلواتے تھے۔ مجھے مسخرا پن سوجھتا تو کہتا "جی نہیں، رئیس نہیں، رئیسِ اعظم"۔

وہ کھِل جاتے تو مَیں دبی زبان سے کہتا "دلّی میں فقیر تو صرف میں ایک تھا" اس پر ایک قہقہہ پڑتا اور ان کی رسیلی ہنسی میں اُڑ جاتی۔ بڑا لطف آرہا تھا اِس نئی زندگی میں۔ ہم نے اچھا وقت دیکھا تھا تو کیا بُرا وقت دیکھنے کے لئے کوئی اور آتا؟ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ۔ اِن ہیٹوں کا یہی سبکھ۔ لہٰذا ہمارا عمل "مرتے جائیں ہلہاریں گائیں" پر رہا۔ عاشق کا جنازہ تو ذرا دھوم سے نکلنا چاہئے۔ ہم ہنس ہنس کر اپنے نیل اُڑاتے رہے اور گا گا کر اپنے غم بھلاتے رہے۔

یہی شب و روز تھے کہ ایک دن دونوں وقت ملتے ایک بڑے رنگین سے نوجوان سامنے آکھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ اُنہوں نے سلام کیا۔ میں نے اُنہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پر سفید کشتی نما ٹوپی، گول چہرہ، یاسمینی رنگ، کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، کتارسی ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہِ زنخداں، ڈاڑھی مونچھ صاف، سفید سلک کی شیروانی، اکہرا پاجامہ، اور پاؤں میں سفید سانبھر کی جوتی۔ اس طرحدار نوجوان کو دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آگئی (گو خوبصورتوں میں میرا شمار کبھی نہیں ہوا)۔ میں کوارٹر کے آگے چارپائی بچھائے بیٹھا تھا۔ ایسے موقعوں پر مجھے شیکسپیئر کا ایک فقرہ ضرور یاد آجاتا تھا ــــ "میں اپنے غموں کے ساتھ یہاں بیٹھا ہوا ہوں، بادشاہوں سے کہو کہ یہاں آئیں اور مجھے تعظیم دیں"۔ نہ جانے کیوں مجھے اِس فقرے سے بڑی تسلّی ہوتی تھی۔ مجھے بالکل شرمندگی نہیں ہوئی کہ میں کھرّی چارپائی پر تہمد اور بنیان پہنے بیٹھا ہوں اور ایک نفیس مزاج مُلاقاتی سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا "تشریف لائیے۔ یہیں آجائیے میرے پاس"۔ میں ذرا اُوپر کو کھسک گیا اور وہ بغیر کسی پس و پیش کے اَدوان پر بیٹھ گئے۔ "میرا نام جمیل جالبی ہے"۔ یہ نام میرا سُنا ہوا تھا اور میں نے اِن صاحب کا ایک آدھ مضمون بھی پڑھ رکھا تھا۔ میں نے پوچھا "آپ کا تعلّق کچھ مولانا جالب دہلوی سے ہے؟"

بولے "جی ہاں، وہ میرے دادا تھے"۔ "تو پھر آپ ذرا آرام سے بیٹھیے اُوپر ہو کر۔ آپ سے مفصّل باتیں ہوں گی"۔ اور پھر بہت دیر تک اُن سے دُنیا زمانے کی باتیں ہوتی رہیں، اور مجھے اندازہ ہوا کہ یہ طرحدار نوجوان آج کل کے نوجوانوں کی طرح کھوکھلا نہیں ہے اور اسکے ظاہر کی طرح اِس کا باطن بھی اُجلا ہے۔ شرافتِ نسب شرافتِ نفس کی ذمّہ دار تھی۔ میر جالب دہلوی کو کس صدی کا کون اُردو پڑھا لکھا آدمی نہیں جانتا؟ انہوں نے بیسیوں اخباروں کی اڈیٹری کی۔ زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ میر صاحب سے اگر آپ نے کچھ پوچھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ بس جان غضب میں آگئی۔ اُنہیں یہ خبر نہیں کہ سڑک ہے یا بازار ہے یا چوک ہے، اُن کے علم کا دریا بہنے لگتا۔ اب آپ لاکھ پیچھا چھڑائیں میر صاحب جھاڑ کا کانٹا بن کر آپ کو لپٹے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب آپ اپنے گھر کا رُخ کرینگے تو یہ بھی آپ کے ساتھ ہو لیں گے اور ان کا لکچر جاری رہے گا۔ آپ اپنے گھر پہونچ جائیں گے تو میر صاحب ڈیوڑھی ہی میں کھڑے اپنے بے پناہ علم سے آپ کو فیض پہونچاتے رہیں گے۔ یہ لکچر اُس وقت ختم ہوتا جب میر صاحب چونک کر دیکھتے کہ اُن کا مخاطب روپوش ہو گیا۔ اور خود کھڑے در و دیوار سے باتیں کر رہے ہیں۔

جمیل صاحب پہلے ہی دن اس قدر محبّت، خلوص اور عقیدت سے ملے کہ اُن سے اُسی دن سے دوستی کی بُنیاد پڑ گئی۔ مارٹن کوارٹرز کے پیچھے پیر الہٰی بخش کالونی کے دو ہزار کوارٹر زیرِ تعمیر تھے۔ کالونی کا کچھ حصّہ بن چکا تھا۔ اسی میں جمیل صاحب اپنے چھوٹے بھائی عقیل صاحب کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے والدین اور چھوٹے بہن بھائی اُس وقت میرٹھ ہی میں تھے۔ یہ دونوں بھائی بغرضِ تعلیم پہلے چلے آئے تھے۔ جمیل صاحب ایم۔ اے اور ایل ایل بی میں پڑھ رہے تھے اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹری کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ جمیل صاحب کو ادبی ذوق ورثے میں ملا

تھا۔ علمی اور تنقیدی مضامین لکھنے کا انہیں شوق تھا۔ رفتہ رفتہ ساقی کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹانے لگے۔ ہر مہینے ساقی میں "باتیں" بھی لکھنے لگے۔ میں نے اُن کا نام ادارۂ ساقی میں شریک کر لیا تاکہ ان کی خدمت کا اعتراف ہو جائے۔

جمیل صاحب کے والد میرٹھ کے متموّل لوگوں میں سے ہیں جبتک ہندوستان اور پاکستان میں روپے کی آرجارہی میرٹھ سے دونوں بھائیوں کے اخراجات کے لئے روپیہ آتا رہا۔ جب یہ سلسلہ بند ہو گیا تو جمیل صاحب نے بہادر یار جنگ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری قبول کر لی۔ اس سے انہیں اتنا مل جاتا تھا کہ دونوں بھائی بافراغت گزر کر لیں۔ ویسے بھی یہ دونوں بھائی بڑی محتاط زندگی بسر کرتے تھے۔ اِن کے دوستوں کی تعداد بھی بہت کم تھی، پھر کسی عیب میں نہیں، یہانتک کہ سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے۔ کوئی بیہودہ یا مہنگا مشغلہ بھی نہیں تھا۔ ادب کے چسکے نے انہیں بُرائیوں سے بچائے رکھا۔ مگر ادیبوں اور شاعروں کو ایسا بھی دیکھا ہے کہ دُنیا جہان کے اُن میں عیب آجاتے ہیں۔ دراصل یہ اِن کی شرافتِ نسبی اور عمدہ تربیت تھی جس نے انہیں بدکرداری سے بچائے رکھا۔ بعد میں جب انکے والدین آ گئے تو میں نے دیکھا کہ ماں باپ دونوں صوم و صلوٰۃ کے پابند اور بچوّں پر کڑی نظر رکھنے والے ہیں۔ ورنہ کسی وجیہہ اور خوبصورت نوجوان کے بگڑتے میں کیا دیر لگتی ہے، خصوصاً جبکہ پیسہ بھی ہاتھ میں ہو۔ مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ کالج کی کئی لڑکیاں جمیل صاحب سے التفات کر رہی ہیں مگر اِنکی بے التفاتی انہیں زیادہ قریب نہیں ہونے دیتی۔ جمیل صاحب عمر میں میرے لڑکے میاں مشہود سے زوایک سال چھوٹے ہی ہونگے۔ اِس لئے میں اُن سے ایسی نجی باتوں کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی میرا ادب لحاظ اسی طرح کرتے تھے جیسے اپنے کسی بزرگ کا کرنا چاہئے۔ یہ حفظِ مراتب خدا کا شکر ہے کہ اب بھی قائم ہے۔ بلکہ میں بعض اوقات

اپنی رَو میں اس حد کو بھول جاتا ہوں، جمیل صاحب کبھی نہیں بھولتے۔

جمیل صاحب سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ اُن کی شخصیت میں کھر بائیت اور ان کی باتوں میں موھنی ہے۔ چھل فریب مکاری اور چالاکی ان میں نہیں ہے۔ باتیں بڑی بھولی بھولی کرتے ہیں۔ ایک دن ہچکچاتے ہچکچاتے بولے "آج ہمارے ہاں کھانا کھا لیجئے"۔ میں نے کہا "کیا مضائقہ ہے، کھالیں گے"۔ چنانچہ دوپہر کو وہ مجھے لینے آگئے اور میں انکے ساتھ ہولیا۔ یہیں کالونی میں ان کا کوارٹر قریب ہی تھا۔ کوارٹر میں سوائے ان کے ایک دوست کے، جو انہی کے ساتھ رہتے تھے، اور کوئی نہیں تھا۔ چھوٹے بھائی عقیل کو میں نے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ کالج سے دیر میں آتے ہیں۔ جمیل صاحب نے، اپنے مُلازم کو آواز دی۔ ایک منٹ میں اُس نے آکر میز لگا دی اور اس پر دستر خوان بچھا دیا۔ نوکر کی وضع قطع دیکھ کر میں چکرا یا۔ اٹھلا کر چلتا تھا اور مٹک کر بات کرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے جمیل صاحب سے پوچھا "کیا یہ تیسری جنس کا آدمی ہے؟" انہوں نے کہا "جی ہاں۔ مگر بڑا وفادار اور کامی ہے"۔ اتنے میں ٹرے میں رکابیاں اور دو ڈونگے لئے وہ آگیا اور میز پر انہیں رکھ کر ادائے محبوبی سے اٹھلاتا چلا گیا۔ میں نے کہا "جمیل صاحب، اچھا نمونہ پالا ہے آپ نے"۔ جمیل صاحب ہنس کر چپ ہو رہے۔ دستر خوان میں روٹیاں لپیٹے وہ لپاک جھپاک چلا آرہا تھا۔ روٹی رکھ کر اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔ ایلو! پھر چلا آرہا ہے ٹرے میں شیشے کا جگ برف آب سے لبریز، اور تین گلاس لئے۔ کھٹا کھٹ اُس نے ایک برابر کی میز پر انہیں رکھ دیا اور پھر لپک گیا۔ میں نے کہا چھلاوا بنا ہوا ہے کمبخت۔ اس کا نام تو آپ بجلی رکھئے۔ جمیل صاحب کے ساتھ ان کے دوست بھی ہنس پڑے۔ اب کے پھیرے میں وہ ایک طشتری میں قلاقند لایا اور میز پر رکھ کر مودّب کھڑا ہو گیا۔ جمیل صاحب نے کہا "تم جاؤ۔ ضرورت

ہو گی تو بُلا لیں گے۔" وہ چلا گیا۔ شاید ہم اُس کی موجودگی میں بے تکلفی سے باتیں نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اُسے چلتا کیا۔ جمیل صاحب نے ایک ڈونگا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "بسم اللہ کیجئے۔" میں نے جو ڈونگے کا سرپوش ہٹایا تو مچھلی کا بھنا ہوا سالن دکھائی دیا۔ تصور کی میٹھی کی خوشبو نے اُڑ کر بھوک پر سان رکھ دی۔ دوسرا ڈونگا کھولا تو اس میں ماش کی دال جس پر ہری مرچیں اور پودینہ چھڑکا ہوا اور بریاں کی ہوئی پیاز کے سُرخ لچھے! دل سے جمیل صاحب کے لئے دُعا نکلی۔ مگر کیا جمیل صاحب دلوں کا حال بھی معلوم کر لیتے ہیں؟ اُنہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مچھلی اور ماش کی دال میرا من بھاتا کھاجا ہیں؟ یا یہ محض حُسنِ اتفاق تھا؟ یہ بھید آج تک نہیں کھلا۔ خیر، ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ میں نے پوچھا "یہ کھانا انہی صاحب نے ـــ نہیں ـــ انہی خاتون نے ـــ اِنہی حضرت نے پکایا ہے؟" جمیل صاحب نے کہا "جی ہاں۔" میں نے کہا "بھئی کمال کر دیا۔ ہم نے تو سُنا تھا کہ اِس جنس کے کسی کام میں بھدرک نہیں ہوتی۔" وہ بولے "اب آپ خود دیکھ لیجئے۔ پھر گھر کو بھی صاف سُتھرا رکھتا ہے۔ رات کو پاؤں بھی دباتا ہے۔" میں نے کہا "واقعی میں، گھر کو تو اس نے جنیدان بنا رکھا ہے۔ مگر کیا کہا آپ نے: رات کو پاؤں بھی دباتا ہے؟" جمیل صاحب میرے اشارے کو سمجھ گئے اور اُن کا صبیح چہرہ گلابی ہو گیا۔ میں نے اس مخمصے کو ٹالنے کے لئے کہا: "یہ مخلوق واقعی بڑی خدمت گزار اور وفادار ہوتی ہے۔ پھر بھی آپ اس کی طرف سے ہوشیار رہیں۔" کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم باہر برآمدے میں آئے تو دیکھا کہ مجلی صاحب ہاتھ میں لوٹا اور صابن لئے اور کندھے پر اُجلا تولیہ ڈالے سُدھ کھڑے ہیں۔ میں نے اب کے انہیں ذرا غور سے دیکھا۔ توبہ توبہ خاصہ مکروہ چہرہ تھا اس کا۔ میں نے کہا "کھانا تم نے بہت اچھا پکایا۔" مُسکرا کر کھیسیں نکال دیں۔ ہاتھ دُھلوائے، تولیہ پیش کیا۔ اس کی سلیقہ مندی سے جی بہت خوش ہوا مگر اس سے استکراہ پھر بھی باقی رہا۔ کچھ

عرصہ بعد جمیل صاحب کے ہاں پھر کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تو دوسرا ہی آدمی نظر آیا۔ پوچھا "وہ بجلی صاحب کہاں ہیں؟" بولے "وہ ٹھیک نہیں تھا، اُسے ہم نے نکال دیا"

جمیل صاحب نے ایم۔ اے اور ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد بھی ہیڈ ماسٹری جاری رکھی۔ اسکول والے ان کی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور یہ اپنی سادگی میں معلّمی پر قانع ہو گئے تھے۔ مگر چند بھلے آدمیوں کے کہنے سُننے پر اس پر رضامند ہو گئے کہ پی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں بیٹھ جائیں۔ محنتی اور ذہین آدمی کے لئے کوئی راہ بند نہیں ہوتی۔ چنانچہ جمیل صاحب اس سخت امتحان میں بھی کامیاب ہو گئے اور انکم ٹیکس افسر بنا دیئے گئے۔ سرکاری مُلازم بن جانے کے بعد اُن کا نام ادارہ ساقی میں سے ہٹا دینا پڑا مگر نجی طور پر ان کا تعلّق ساقی سے بدستور قائم رہا۔ بلکہ اُن کی یہ وضعداری اب تک قائم ہے۔

جمیل صاحب جب اپنے عُہدہ پر مامور ہوئے تھے تو میں نے انہیں دوستانہ اور بزرگانہ نصیحت کی تھی کہ رشوت یا دل آزاری کا پیسہ کبھی نہ لینا۔ بُری کمائی ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ میں نے ایسے بہت سے تماشے دیکھے تھے۔ وہ قصّے سب اُنہیں سُنائے۔ میں اگر انہیں یہ نصیحت نہ کرتا تب بھی اُن سے توقّع یہی تھی کہ ایسا کوئی غلط اقدام وہ نہیں کریں گے، مگر روپیہ بُری چیز ہے، خصوصاً بڑی مقدار میں جب کسی ناتجربہ کار نوجوان کی دسترس میں ہو۔ خدا کا شُکر ہے کہ جمیل صاحب قعرِ دریا میں تختہ بند ہونے کے باوجود تر دامنی سے بچے رہے۔ ویسے بھی بچپن کی اچھی تربیت اور خاندان کی آسودہ حالی کے باعث ان کی سیر چشمی نے انہیں لغزش سے بچائے رکھا۔ اور جمیل صاحب بڑی ہوشیاری سے اس ہفت خواں کو طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اس عرصہ میں جمیل صاحب کے والدین کراچی آ چکے تھے۔ ہندوستان میں جمیل صاحب کے والد کی بسیں چلتی تھیں۔ یہاں بھی انہوں نے آ کر بسیں چلائے

کا کام شروع کیا۔ پیسے والے ہوتے ہوئے بھی یہ مزدور قسم کے آدمی ہیں۔ ماشاء اللہ بھرا پُرا خاندان۔ جمیل صاحب کی تنخواہ اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ ہو کر رہ گئی۔ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ! سارے خاندان کا خرچ بزرگوار نے اپنے ذمّے لیا۔ پہلے جمیل صاحب کی شادی کُنبے ہی کی ایک سلیقہ مند لڑکی سے کی۔ اس سے بہت سی اُمیدوار لڑکیوں کے دلوں پر سانپ لوٹا۔ خود جمیل صاحب بھی دبی دبائی کامی لڑکی کو آج کل کی تیتریوں پر ترجیح دیتے تھے۔ اپنی شادی سے مطمئن اور خوش ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد اُن سے چھوٹی بہن کی شادی ہوئی۔ پھر اُس سے چھوٹی کی شادی ہوئی، اور اب آخر آخر میں میاں عقیل کی شادی ہوئی ——— ڈاکٹر بن جانے کے بعد۔ اب سہیل میاں کو پانچ سال کے لئے اپنے خرچ سے اُن کے والد اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھیج رہے ہیں۔ یہ باتیں میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے اگر والدین سلیقہ مند ہوں تو اپنی اولاد کو سہارا دے کر کس طرح باعزت زندگی بسر کرنے کی راہ پر لگا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ع این خانہ تمام آفتاب است۔ لڑکیوں نے بھی اعلیٰ تعلیم پائی مگر انہیں اس زمانے کی ہوا نہیں لگی۔ سلیقہ مند ایسی کہ دسوں اُنگلیاں دسوں چراغ۔ لڑکوں میں ایک انکم ٹیکس افسر، دوسرا ڈاکٹر، اور تیسرا انجینئر بننے جا رہا ہے۔ مگر اتنے اطاعت گزار اور تمیزدار کہ میں نے انہیں اپنے باپ سے نظریں ملا کر کبھی بات کرتے نہیں دیکھا۔ باپ کا تو خیر مرتبہ ہی ایسا ہوتا ہے، اپنے سے بڑوں کا بھی اسی طرح ادب لحاظ کرتے ہیں۔ کراچی میں ایک ایسے خاندان کو دیکھ کر جی بہت خوش ہوتا ہے اور اب سے چالیس پچاس سال پہلے کے دلّی کے شرفا کے خاندان یاد آجاتے ہیں۔ ہمارے تعلقات اس خاندان سے رفتہ رفتہ اتنے بڑھ گئے کہ اکثر حضرات سمجھتے ہیں کہ ہم ایک ہی کُنبے کے افراد ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اس پر فخر کرتا۔

جمیل صاحب خاصے بھولے آدمی ہیں۔ فوراً لوگوں پر اعتماد کر لیتے ہیں اور اکثر

مُعتمد بعد میں غلط ثابت ہوتے ہیں تو انہیں غصہ نہیں آتا، افسوس ہوتا ہے اور اُن پر ترس آتا ہے۔ انگریزی کا ایک اخبار نویس میرے پاس ایک دن آیا اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے چلا گیا۔ گفتگو میں بار بار جمیل صاحب کا ذکر اس طرح کرتا جیسے ان سے اس کے بڑے گہرے تعلقات ہوں۔ میں اس کے رویّے سے کھٹک گیا تھا کہ یہ کبھی کا نہ آنے والا اچانک آ کر میری تعریف میں کیوں مرا جا رہا ہے۔ مجھ پر مضمون کیوں لکھنا چاہتا ہے اور مجھے سبز باغ کیوں دکھا رہا ہے۔ اگلے دن وہ چند پُرانے اخباروں کا میلا سا پلندہ لے کر پھر آ گیا اور اپنے چھپے ہوئے مضمون دکھلانے لگا۔ اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد بولا "اچھا اب اجازت دیجئے۔ جب آپ کو فرصت ہو اِس نمبر پر مجھے ٹیلیفون کر لیں، میں انٹرویو کے لئے حاضر ہو جاؤں گا۔" میں اُسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ پلٹ کر ایک دم سے اُس نے کہا "ایک دس روپے تو نہیں ہوں گے آپ کے پاس؟ میں جلدی میں اپنا پرس گھر بھول آیا۔ جمیل کے پاس گیا تھا، وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں کل اِسی وقت دے جاؤں گا۔" میں جانتا تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے مگر میں نے ایک لمحے ہی میں فیصلہ کر لیا کہ اگر دس روپے اِسے دے کر اس سے پیچھا چھوٹ سکتا ہے تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔ میں نے دس کا ایک نوٹ اندر سے لا کر دیا۔ اُس نے لے کر کہا "بس کل اِسی وقت" اور چل دیا۔ اگلے دن بھلا کون آتا تھا۔ تیسرے دن میں نے کہا لاؤ ذرا ٹیلیفون کر کے دیکھیں تو سہی کہ کیا کہتا ہے۔ دیئے ہوئے نمبر پر ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی اخبار کا دفتر ہے۔ میں نے اُن صاحب کا نام لیا کہ اُن کو بُلوا دیجئے۔ جواب ملا کہ اس نام کا کوئی آدمی اِس دفتر میں نہیں ہے۔ اخبار کے اڈیٹر سے میری شناسائی تھی۔ میں نے اُن سے ٹیلی فون ملایا۔ جیسے ہی میں نے اُن صاحب کا نام لیا وہ بولے "آپ سے وہ کچھ لے تو نہیں گیا؟" میں نے کہا "دس روپے لے گیا۔" وہ افسردہ ہو کر بولے

"مدت ہوئی ہم نے اُس شخص کو علیحدہ کر دیا۔ آدمی ذہین ہے مگر ناکارہ۔ اب وہ یہی کرتا پھرتا ہے اور نمبر کمبخت ہمارا سب کو بتاتا ہے۔ کئی اور شکایتیں بھی آچکی ہیں۔ اب صبر کیجئے اور آئندہ کبھی اُس شخص کا اعتبار نہ کیجئے جو کہے کہ میں اپنا پرس گھر بھول آیا ہوں۔" اگلے دن میں جمیل صاحب کو آگاہ کرنے کے لئے اُن کے گھر پہونچا۔ اس کا نام سُنتے ہی انہوں نے پوچھا "آپ سے کچھ لے تو نہیں گیا؟" میں نے کہا "دس روپے۔ مگر آپ ہوشیار رہئے۔ وہ آپ کے پاس بھی پہونچے گا۔" بولے "مجھ سے تو وہ پہلے ہی لے جاچکا ہے۔" میں نے کہا "چلو دس روپے ہی پر ٹلی۔" بولے "جی نہیں، وہ پھر آئے گا۔ مجھ سے تو وہ کئی بار دس دس پانچ پانچ کر کے لے جاچکا ہے۔" میں نے کہا "اور آپ دیئے جارہے ہیں؟" بولے "کیا کروں مجھے اُس کی مفلسی پر ترس آتا ہے۔" کبھی انہیں ترس آجاتا ہے، کبھی انہیں خوفِ خدا ستاتا ہے، اور کبھی اِن کا جی جاہ جاتا ہے۔ طالب علموں کی فیس اپنے پاس سے دے دیتے ہیں، کتابیں دلوا دیتے ہیں، امتحان کی فیس داخل کر دیتے ہیں۔ دوستوں میں سے کسی نے کہا "جمیل صاحب، آپکا فلاں کام ہو گیا مٹھائی کھلوایئے۔" بولے "چلیئے!" دو چار جتنے بیٹھے ہیں سبکو عبدالحنان کی دُکان پہ لے کر پہونچ گئے اور مٹھائی اور سلونا کھلا لائے۔ ایک بے تکلف ہمدفتر نے کہا "اپیل جیت گئے۔ دعوت ہوگی۔ مُرغ اور آئس کریم کی۔" تو صاحب! بارہ خاص خاص دوستوں کی دعوت ہوگئی۔ بس بُھنے ہوئے مُرغ میز پر آگئے۔ اور تھوڑی دیر میں ہڈیاں ہی ہڈیاں میز پر رہ گئیں۔ کھانے کے ساتھ انصاف کرنے والے بھی تو ایسے ہوں! چار گھان آئس کریم کے بھی بیاروں کے پیٹ میں اُتر گئے۔ اور جمیل صاحب کِھلے جارہے ہے کہ دوستوں کی خوشی پوری ہو رہی ہے۔

پی، ای، این کی نمائندگی کرنے جب وہ پیرس گئے تھے تو وہاں بھی ایک جگہ اِن کا جی جاہ گیا تھا۔ پروفیسر سید علی احسن نے بتایا کہ یہ جمیل بھی عجیب آدمی ہے۔ پیرس

میں ہماری حیثیت مہمانوں کی تھی، مگر جتنے مندوبین وہاں جمع تھے سب کو اس نے نہایت مہنگی شراب پلوادی۔ میں نے پوچھا "جمیل صاحب، بھلا یہ کیا حرکت تھی؟" بولے "میراجی چاہ گیا اُس وقت۔"

جمیل صاحب کو سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کسی بات کا شوق نہیں ہے۔ مُلازمت کی دماغ سوز مصروفیت کے باوجود اتنا وقت ضرور نکال لیتے ہیں کہ اپنا مُطالعہ بھی جاری رکھیں اور کچھ لکھ بھی لیں۔ انہوں نے اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی بنالی ہے جس میں بعض نایاب کتابیں بھی ہیں۔ اس لائبریری میں وہ جم کر بیٹھتے ہیں اور گھنٹوں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں۔ طبعزاد مضامین بھی لکھتے ہیں اور ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ دنوں کی محنتِ شاقہ کے بعد انہوں نے اس مہم کو سر کیا اور ایک مجموعہ چھپوا کر ہمارے علمی سرمایہ میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ کیا۔ ایسے مُشکل کام وہی شخص کر سکتا ہے جو دُھن کا پکّا ہو۔ اُردو کے کلاسیکی ادب کا بھی مطالعہ کرنے کے لئے بڑے صبر و سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جمیل صاحب اس کی ضخیم جلدوں کو بھی دیمک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ "فسانۂ آزاد" کی چار جلدوں کو مع مقدمہ وحواشی کے شائع کرانا چاہتے تھے، مگر اس کے لئے انہیں کوئی پبلشر نہیں ملا۔ منشی سجّاد حسین کی نایاب کتاب "حاجی بغلول" انہوں نے ایڈٹ کر کے چھپوائی ہے۔ اور اب مہینوں سے جعفر زٹلی کے کلام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے مختلف نُسخے اِدھر اُدھر سے جمع کئے ہیں۔ ہندوستان سے اس کی نقلیں منگوائی ہیں، لندن سے ایک مستند نُسخے کا مائیکروفلم بھی منگالیا ہے۔ مجھے تو انہیں اس کام میں مُنہمک دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ مگر یہ اللہ کا بندہ اس خضوع و خشوع سے اس کام کو کر رہا ہے کہ اگر کوئی دینی کام اسی اہتمام سے کرتا تو اب تک کئی دفعہ کھڑا اور پڑا جنت میں چلا گیا ہوتا۔ دراصل ایسے بے غرض کام کرنے والوں کو کسی علمی وادبی ادارہ سے مُنسلک ہونا

چاہیئے تھا۔ مگر یہاں تو مولوی عبدالحق مرحوم ہی کو کسی نے نہ پوچھا، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا۔

جمیل صاحب کے ادبی کارناموں میں "نیا دور" کا اجرا بھی ہے۔ جب "نیا دور" جاری ہوا تو جمیل صاحب نے مجھ سے بھی مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس کے پیش رَو میں بھی لکھا کرتا تھا اور دلّی کے فسادات پر میرا طویل مضمون (جو مجھے بعد میں شیریں صاحبہ نے بتایا کہ رپورتاژ ہے) "دلی کی بپتا" اسی کے فسادات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ "نقوش" کے شخصیت نمبر میں طفیل صاحب کی فرمائش پر میں نے مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم کا خاکہ لکھا تھا۔ اور اسی خاص نمبر میں چند اور مختصر خاکے بھی لکھے تھے جسنِ اتفاق سے انہیں قبولِ عام حاصل ہوا۔ جمیل صاحب کی فرمائش یہ تھی کہ یا تو رپورتاژ لکھو، یا خاکہ، یا کسی عالمی شاہکار کا ترجمہ دو۔ میں کئی دن تک سرگرداں رہا کہ اپنے پیارے دوست کے لئے کیا لکھوں۔ اور ایک دن میں نے بیٹھ کر اُن کے لئے خواجہ حسن نظامی کا خاکہ لکھا۔ جمیل صاحب اِسے پڑھ کر پھڑک گئے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک نشست میں مجھے لے جا کر اِسے پڑھوایا۔ اِس مضمون کو سُننے کے لئے چند خاصانِ ادب کو بطور خاص بُلایا گیا تھا۔ غنیمت ہے کہ سب نے اِسے پسند فرما لیا۔ پھر اِسے "نیا دَور" میں شائع کیا تو فرمائشیں آنے لگیں کہ اس سلسلے کے اور مضامین بھی لکھوائیے۔ اے روشنئ طبع تو برمن بلا شُدی۔ میں لاکھ کہتا ہوں کہ میں ادیب نہیں ہوں، اڈیٹر ہوں، مگر اڈیٹر ہیں کہ کہتے ہیں تم ادیب پہلے اور اڈیٹر بعد میں ہو۔ مجھے مولیئر کا "زبردستی کا ڈاکٹر" یاد آیا۔ سچ کہیں بِلّی تو بِلّی ہی سہی۔ لاؤ آج سے ادیب بن ہی جاؤ۔ چنانچہ بن گئے ادیب۔ مگر اِس لفظ کی لاج رکھنی کس قدر مشکل ہے۔

"نیا دور" بڑی آب و تاب سے نکلا۔ میرا مضمون بھی اس میں شامل تھا چند روز بعد اسکے منیجر صاحب آئے اور ایک بند لفافہ مجھے دے گئے۔ میں نے لفافہ کھولا۔ دس دس روپے کے کئی نوٹ نکلے اور جمیل صاحب کا مُنکسرانہ خط تھا۔ کچھ بُرا سا معلوم

ہوا، حالانکہ اکثر پرچے میرا مضمون شائع کرنے کے بعد حسبِ توفیق مجھے معاوضہ بھیج دیتے ہیں اور میں اسے شکریے کے ساتھ قبول کر لیتا ہوں۔ نہ معلوم جمیل صاحب کی یہ پیشکش مجھے ناگوار کیوں گزری۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ ہر بہانے میری خدمت کرتے رہتے ہیں، شاید اس وجہ سے کہ میاں مشہود کی طرح وہ ہمیشہ میرا خیال رکھتے ہیں۔ میں نے اُسی وقت انہیں پرچہ لکھا کہ "یقیناً روپیہ دُنیا کی بہت بڑی قوت ہے، اور روپے کی کس کو ضرورت نہیں ہوتی؟ لیکن سارے کام روپے ہی کے لئے نہیں کئے جاتے، بعض کام برہنائے خلوص کئے جاتے ہیں۔ آپ سے میں معاوضہ قبول نہیں کر سکتا۔ آئندہ اس کی زحمت نہ فرمائیں۔" میں نے لفافہ بند کر کے اُن کے منیجر کو دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد جمیل صاحب خود حیران پریشان چلے آئے۔ بولے "شاہد بھائی، خدا کی قسم یہ آپ کے مضمون کا معاوضہ نہیں ہے، رونمائی ہے۔ بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا "بھائی میں آخر تمہارے احسانات سے کہاں تک دبتا چلا جاؤں؟ میں اگر روپے پیسے سے تمہاری خدمت نہیں کر سکتا تو کیا قلم سے خدمت کرنے کا موقع بھی مجھے نہیں دینا چاہتے؟" جمیل صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں دلّی میں کیا تھا اور یہاں آنے کے بعد مجھے کیا بن جانا پڑا۔ بیچارے عجب مخمصے میں پڑ گئے، گئے تھے نماز بخشوانے روزے گلے پڑے۔ میں نے کہا "آپ اس کا خیال یا ملال نہ کیجیے۔ مضمون میں آپ کے لئے آئندہ بھی لکھتا رہوں گا۔ اب آپ بیٹھیے، چائے پیجیے اور کچھ اور باتیں کیجیے۔" بولے "اس وقت تو معافی چاہتا ہوں، جانا ہے، پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔" اس کے بعد میرے اور اُن کے درمیان معاوضہ کا ذکر کبھی نہیں آیا۔ مگر جمیل صاحب غیور آدمی ہیں، تاک میں لگے رہے کہ اس کا تدارک آئندہ کس طرح کیا جائے۔ ایک دن آئے تو بولے "بڑی گرمی ہے۔ آپ نے پنکھا نہیں لگوایا؟" میں نے کہا "ہاں، ذرا ایسا ہی موقع ہو رہا ہے۔" اگلے دن جو میں شام کو گھر واپس آیا تو دیکھا نیا

پنکھا چھت میں لٹکا ہوا ہے۔ بچوں نے بتایا کہ جمیل صاحب نے مستری کو بھیجا تھا، وہ لگا گیا ہے۔ اب خفیف ہونے کی میری باری تھی۔ عندالملاقات میں نے کہا "حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟" بولے "اب آپ کچھ نہ کہئے۔ حسابِ دوستاں در دل"۔ جب میری بیوی نے اس عمر میں دن بھر ایک اسکول میں پڑھانے اور خرابیٔ صحت کے باوجود سیکنڈ ڈویژن میں ایم۔ اے پاس کیا تو سب کو بہت خوشی ہوئی اور جمیل صاحب کو سب سے زیادہ۔ گھر میں زنانہ میلاد شریف ہوا۔ جمیل صاحب کی بیگم، والدہ اور بہنیں بھی آئیں مٹھائی تو کئی خواتین لے کر آئیں مگر جمیل صاحب کی بیگم مٹھائی کے علاوہ نائیلون کی ایک پھول دار ساڑھی بھی تحفتاً لے کر آئیں۔ میری بیوی نے پوچھا "یہ زیر باری کیوں؟" بیگم جمیل نے کہا "بھابی، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ نے کتنا ناممکن کام کیا ہے۔ جمیل صاحب تو ایک ایک سے آپ کی تعریف کر رہے ہیں۔ آج صبح مجھے اپنے ساتھ ایلفی لے گئے تھے کہ بھابی کو تحفہ دینے کے لئے ایک ساڑھی پسند کر دو۔ میں نے آپ کے لئے یہ مہندی کا رنگ پسند کیا ہے۔ آپ کو شوخ رنگ پسند نہیں ہیں نا؟ مجھے تو یہ بہت اچھی لگی۔ آپکو پسند آئی؟" ــــ اور یوں جمیل صاحب کو جب بھی موقع ملتا ہے ہم پر احسان کا وار کر جاتے ہیں۔

یادش بخیر حضرت جوشؔ ملیح آبادی کھانے پینے کے بڑے رسیا ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف پینے کے، جی نہیں، کھانے کے بھی۔ مجھے چند بار اُنہیں کھاتے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس معاملے میں وہ قطعی غیر شاعر ہیں۔ جوشؔ صاحب بڑی بے دردی سے کھانے پر پلتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ادھر سورج غروب ہوا اور اُدھر وہ ساغر بکف طلوع ہوئے۔ دو دو گھنٹے تک اُن کا یہ شغل جاری رہتا ہے۔ مُفت خورے تو ساتھ لگے ہی رہتے ہیں مگر یہ اتنے تنک ظرف ہوتے ہیں کہ ایک ایک دو دو گلاس ہی میں چھلک جاتے ہیں۔ جوشؔ بلانوش ہیں، دو گھنٹے میں چار چھ جتنے بھی گلاس ہو جائیں سب چڑھا جاتے ہیں اور ذرا

نہیں بہکتے۔ بلکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اُن کی گل افشانیِ گفتار دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ دو گھنٹے کے اس ریاض کے بعد کھانا طلب کیا جاتا ہے۔ اب آپ ان کے تناولِ طعام کی رفتار دیکھئے۔ بریانی کی چوٹی دار قابیں آتی رہیں گی اور غائب ہوتی رہیں گی۔ قورمہ اور شیرمالیں پناہ مانگ جائیں گی۔ آم کی گٹھلیوں کا ڈھیر سامنے لگ جائے گا اور ہلاکو کے کھوپڑیوں کے مینار کی یاد تازہ کر جائے گا۔ جوشؔ صاحب کی اس خوش خوری کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ کم از کم ایک شخص تو ہماری برادری میں ایسا ہے جو کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکتا ہے۔

ہاں تو جوشؔ صاحب نے ایک دن لاڈ میں آکر جمیل صاحب سے کہا کہ "آپ ہماری دعوت کر دیجئے۔" انہوں نے کہا "بسم اللہ جس دن آپ فرمائیں۔" بولے "مگر دعوت میں کچی بریانی اور بگھارے بیگن ضرور ہوں گے۔ آپ کی بیگم حیدرآباد میں رہ چکی ہیں، اور سُنا ہے کہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔" بھولا اور تکلف کا آدمی، بیوی کی تعریف سُنکر خوش ہو گیا۔ دن مقرر ہوا اور وقت مُقرر ہوا۔ مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا گیا مگر مجھے لاہور جانا تھا، دعوت میں شریک نہیں ہو سکا۔ واپسی پر جمیل صاحب سے نہیں قدسی صاحب[1] سے اس دعوت کی رُوداد سُنکر لطف آگیا۔

---

[1] اعجاز الحق قدسی بڑے سنجیدہ اور قابل آدمی ہیں۔ جوشؔ صاحب کے رفیقِ دیرینہ اور مخلص دوست۔ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے کوئی ۲۵ سال پہلے ایک مجموعہ جوشؔ کی نظموں کا "شاعر کی راتیں" چھاپا تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو کے منتہی ہیں۔ نیک اور صالح بزرگ ہیں۔ پہلو میں دلِ زندہ رکھتے ہیں۔ خوش فکر شاعر اور خوش ذوق انسان ہیں۔ مگر قسمت کے ہیٹے ہیں۔ خامہ فرسائی پر گزارہ ہے، اس لئے مُفلسی نے ان کے ہاں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ مگر افلاس ان کا کچھ نہ بگاڑ نہ سکا کیونکہ غیور آدمی ہیں۔ جوشؔ اور قدسیؔ کی یکجائی اجتماعِ ضدین ہے۔

جمیل صاحب نے بڑے اہتمام سے کھانا پکوایا۔ کچّی بریانی اور بگھارے بیگنوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تیار کرایا۔ وقت کی پابندی جمیل صاحب نے کبھی کی ہے نہ کریںگے۔ مہمان نو بجے سے آنے شروع ہو گئے۔ جوشؔ صاحب کو دس بجے جا کر لانا تھا۔ جوشؔ صاحب ہمیشہ لائے جاتے ہیں، آتے کبھی نہیں۔ ساڑھے دس بجے بیگم جمیل نے اطلاع کرائی کہ کھانا تیار ہے۔ جمیلؔ اور جوشؔ کے باہمی دوست قدّوسی صاحب مُبین الحق کی شیورلے کر جوشؔ صاحب کے ہاں پہونچے تو گیارہ بج چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ جوشؔ صاحب کھانے سے فارغ ہو کر استراحت فرما رہے ہیں۔ قدّوسی صاحب نے کہا "انہیں اطلاع کر دو کہ جمیل صاحب کے ہاں سے قدّوسی لینے آیا ہے۔" بھلا جو شخص کہ گھڑی رکھ کر سارے کام کرتا ہو وہ کیسے کسی تاخیر کو گوارہ کر لیتا؟ قدّوسی صاحب نے قدری کرلی، جوشؔ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کہا کہ "بھئی اُس بچارے نے بہت عمدہ انتظام کیا ہے اور دس بارہ مُعزز آدمی آپ کی وجہ سے بلوائے ہیں۔ آپ سب پر پانی پھیرے دے رہے ہیں۔ کچھ تو خیال کیجئے۔" مگر وہ سر ہلا ہلا کر یہی کہتے رہے کہ "اب تو ہم کھانا کھا چکے۔ اب ہم نہیں جائیں گے۔" بڑا ناز تھا قدّوسی صاحب کو اپنی دوستی پر۔ اور کمال یہ ہے کہ اب بھی ہے۔ وہاں سے ناکام لوٹے تو اُلٹے جمیل صاحب پر بھبک پڑے کہ "میاں تم نے دیر کر دی۔ وہ کیسے آ سکتے تھے۔ اُن کے سونے کا وقت ہو گیا۔"

جمیل صاحب کو جوشؔ صاحب کی اصول پرستی سے بہت رنج پہونچا۔ مگر ضبط کر کے بولے "ہاں دیر تو ہو گئی مگر جوشؔ صاحب کو آ جانا چاہئے تھا۔"

جمیل صاحب کا اصول یہ ہے کہ وقت کی پابندی نہ کی جائے۔ جوشؔ صاحب کا اصول یہ ہے کہ وقت کی پابندی کی جائے۔ اِن اصولوں کی ٹکّر میں دعوت کا بیڑا غرق ہو گیا۔ مہمانوں نے کھانا زہر مار کیا اور منہ لٹکائے اپنے اپنے گھروں کو رُخصت ہو گئے ۔۔۔

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟

دراصل جوشؔ صاحب کی خُو "خوئے بد" ہے جو بہانے جواز میں ہزار بہانے تلاش کر لیتی ہے۔ ورنہ حضرت کا اصول تو یہ ہے کہ اِن کا کوئی اصول ہی نہیں ہے۔ جمیل صاحب اس واقعہ سے کبیدہ خاطر ہوگئے تھے مگر ایک دن جوشؔ صاحب ان کے دفتر پہونچ لئے اور جمیل صاحب کی سادگی دیکھئے کہ سب کچھ بھلا بیٹھے اور جوشؔ صاحب سے اُنکے تعلقات پھر اُستوار ہوگئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ زمانے کے بھی اصول بدل گئے ہیں۔

از بزرگاں خطا و از خوردان عطا

جوشؔ صاحب بہانے تلاش کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ جب گلڈ کی بُنیاد رکھی گئی اور پہلے جلسے کے لئے بُلاوے بھیجے گئے تو یہ طے ہوا کہ چند مُعزّز و مُعمّر حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے شرکت کا وعدہ لیا جائے اور بطورِ خاص ان حضرات کا تعارف صدرِ پاکستان سے کرایا جائے۔ چنانچہ بابائے اُردو، پروفیسر مرزا محمد سعید، پروفیسر حامد حسن قادری اور جوشؔ صاحب کی خدمت میں ہم فرداً فرداً گئے اور ان سب نے خوش ہو کر شرکت کا وعدہ فرمایا۔ جلسے کی صبح کو ایک ایک بُنیادی رُکن ان حضرات کی خدمت میں گیا اور انہیں جلسہ گاہ میں لے آیا۔ جمیل صاحب جوشؔ صاحب کو لانے گئے اور مُنہ لٹکائے خالی آئے۔ "ارے بھئی کیوں نہیں آئے؟"

"جی وہ کہتے ہیں کہ گلڈ کا فارم انگریزی میں چھاپا گیا ہے، اس لئے میں شریک نہیں ہوں گا۔"

"کیا اُنہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ گلڈ صرف اُردو کا نہیں ہے، پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کا ہے؟"

"جی ہاں، معلوم ہے ـــــ اسکے باوجود۔"

جوشؔ صاحب گلڈ کے جلسے میں شریک نہیں ہوئے اور نہ گلڈ کے ممبر بنے۔ ہوا

یہ کہ جو لوگ اُنہیں گھیرے رہتے ہیں، اُنہوں نے اِنہیں سنکا دیا کہ آپ کو تو گلڈ میں کوئی بڑا عُہدہ ملنا چاہیئے۔ معمولی ممبر کی طرح شریک ہونا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ یہ بات ان کے گھَٹ میں اُتر گئی۔ مگر اپنے مُنہ سے کیسے کہیں کہ مجھے کوئی بڑا عُہدہ دو تو جلسے میں شریک ہوتا ہوں؟ لہٰذا بہانہ یہ تلاش کیا کہ انگریزی میں گلڈ کے فارم کیوں چھاپے گئے۔ حالانکہ اُنہیں مُنہ پھوڑ کر جالبی صاحب سے کہہ دینا چاہیئے تھا کہ مجھے کوئی بڑا عُہدہ دو۔ آخر اور بہت سی بیہودہ باتیں وہ دوستوں سے (اور غیروں سے بھی) کہہ دیا کرتے ہیں، تو جمیل صاحب انہیں اطمینان دِلا دیتے کہ گلڈ میں عُہدے نہیں بٹ رہے۔ سُنا ہے کہ اب وہ اِس واقعے کو جھٹلاتے ہیں۔ کیا میں اُن سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو آپ آج تک گلڈ کے ممبر آخر کیوں نہیں بنے؟

بے ادب شرط مُنہ نہ کھلواؤ

جمیل صاحب کا عمل FORGIVE & FORGET پر ہے۔ میں اُن سے خفا ہو کر کہتا ہوں کہ اسے بے غیرتی کیوں نہ کہا جائے؟ وہ ایک دل آویز مُسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہیں" ہاں ہے تو ایک طرح کی بے غیرتی ہی۔ مگر میں کیا کروں کہ میرا جی چاہتا ہے۔"

"تمہارا جی تو باؤلا ہو گیا ہے۔ ادب کے نقد و احتساب میں تو تم نے نظر پیدا کر لی، ادیبوں کو پرکھنا بھی سیکھو۔ یہ کیا کہ ذہنی طور پر نابالغ ادیبوں سے لے کر بوڑھے دانشوروں تک سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیتے ہو۔"

بھولا آدمی پھر اپنے جی کا رونا لے بیٹھتا ہے اور اِس غریب کو اس کے حال پر چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ شاید اس حد سے بڑھی ہوئی شیریں مزاجی ہی کی وجہ سے لوگوں نے انہیں جالبی کے بدلے جلیبی کہنا شروع کر دیا ہے۔ جوشؔ صاحب کے پرستارِ خصوصی مولانا قدّوسی سے میں نے کہا" جمیل صاحب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" بولے" وہی جو

جوشؔ صاحب کی۔"

"اُن کی رائے کیا ہے؟"

"کل آپ کو جوشؔ صاحب کا خط دے جاؤں گا۔ دیکھ لیجئے گا۔"

اُس خط کا اقتباس یہ ہے:۔

"جمیل صاحب جالبی، چشمِ بد دور، نکیلے جوان اور طبّاع انسان ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور اُن کے لہجے میں شرافت کی گمک پائی جاتی ہے۔

قُدرت نے اُنکو سُخن فہمی اور بذلہ سنجی کا جوہر بھی عطا کیا ہے اور برمحل صحیح بات کہنے کی صلاحیت بھی دی ہے۔

اُن کی شخصیت میں جاذبیّت اور اُن کی عقل میں تابانی کا امتزاج یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ؎

خدا کے فضل سے یوسفِ جمال کہلائے
اب اور چاہئے کیا ہو، پھیری ہل جائے؟

مرحوم جوشؔ۔"

یہ "مرحوم" کا سابقہ بھی خوب ہے زندہ شہیدوں کی طرح یہ "زندہ مرحوم" ہیں۔ ع
تم سلامت رہو ہر روز کے مرنے والے

خُدا کا شُکر ہے کہ جمیل صاحب شاعر نہیں ہیں، ابتدائے شعور یا بے شعوری کی عمر میں انہیں شعر کہنے کی لت لگ گئی تھی مگر اللہ نے انہیں جلد عقل دیدی اور شعر گوئی ترک کر کے انہوں نے نثر نگاری کی طرف توجہ کرلی۔ مگر کچھ عرصے سے اُن کی نثر نگاری میں ایک خطرناک رُجحان آچلا ہے اور یہ رجحان ہے مُقدمہ نگاری کا، جو نتیجہ ہے مولانا قدوسی کی دوستی کا۔ قدوسی صاحب تصوّف کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھ رہے ہیں۔ تذکرۂ صوفیائے سندھ اور

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور اُن کی تعلیمات پر جمیل صاحب نے عالمانہ مقدمے لکھکر مجھے تو حیرت میں ڈال دیا کہ یہ ادب کا ایک شائستہ طالب علم اور اُردو کا ایک شریف نقاد تصوف اور صوفیوں میں کہاں جاکر پھنس گیا؟ اِن مقدموں کے لکھنے کے لئے اسکو اپنا کتنا خون پانی کرنا پڑا ہوگا! جمیل صاحب کو اِس نوع کی مقدمہ بازی سے بچنا چاہئے۔ اگر خدانخواستہ ان کا شمار علماء یا مولاناؤں میں ہونے لگا تو وہ نہ دین کے رہیں گے اور نہ دُنیا کے۔ مُقدمہ بازی تو مولوی عبدالحق مرحوم ہی پر پھبتی تھی، اور اُنہی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ صحبتِ ناجنس سے گریزاں رہنے والا کہاں اصفیا اور اتقیا میں جا گھسا۔ دُکانِ شیشہ گراں میں سانڈ کا کیا کام؟ نفیس مزاج لوگوں کو ایسی حرکتوں سے باز رہنا چاہئے۔

نفاستِ مزاج پر یاد آیا کہ جمیل صاحب کی عجیب نفاست پسندی بعض اوقات انکے دوستوں کے لئے بڑی صبر آزما ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً انہیں چاندنی راتیں بہت پسند ہیں۔ جاڑے کی چاندنی راتیں بھی، حالانکہ غریب کی جوانی اور جاڑے کی چاندنی کون دیکھتا ہے؟ جناب دیکھتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے جاڑوں میں چاند کی چودھویں شب کو سینڈزپٹ اپنے ساتھ لے گئے۔ چاند نے کھیت کیا، تو سمندر میں دُور تک چاندی کے ٹکڑے تیرتے ہوئے بہت اچھے لگے۔ بس دیکھ لیا انہیں۔ اب گھر چلو۔ نہیں خاموش بیٹھے انہیں تکے جا رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، کوئی حد بھی ہے اِس خوش منظری سے لُطف اندوز ہونیکی؟ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے قُلفی جمی جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ آنکھیں پھاڑے کبھی چاند کو دیکھتے ہیں اور کبھی سمندر میں بکھرے ہوئے چاند کے ٹکڑوں کو۔ تنگ آکر میں نے کہا "اِس سے پہلے کہ آپ ماہ زدہ ہو جائیں اور LUNATIC کہلائیں آپ کھڑے ہو جائیں"۔ بہت لجاجت سے بولے "بس ابھی چلتے ہیں۔ اک ذرا ــــــ" میں نے کہا "ذرا وَرا کچھ نہیں۔ فوراً کھڑے ہو جائیے۔ ورنہ میں یہ چلا۔" ٹھنڈی سانس بھر کر اُٹھے اور ساتھ ہو لئے۔ رات کے بارہ بجے گھر پہنچے۔ ایسا ہی ایک واقعہ حیدرآباد سندھ میں پیش آیا ایک رات کو جب چاند چڑھ

گیا تو اللہ کا بندہ ساری رات شہر کے باہر سُنسان علاقوں میں گھومتا پھرا اور مجھے اس کے ساتھ گھسٹنا پڑا۔ توبہ کی کہ آئندہ کبھی چاندنی رات میں اِس شخص کے ساتھ نہ جاؤں گا۔

گلاب کا پھول سبھی کو اچھا لگتا ہے، خصوصاً کراچی میں کہ کمیاب ہے۔ ایک دفعہ ایک گُل فروش سے سُرخ گلاب کا پھُول لیا تو اُس نے چار آنے کا دیا۔ گلاب کا پھول جمیل صاحب کی کمزوری ہے۔ بے اجازت توڑ لینے یا اس کے چُرا لینے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ جاڑوں میں جب آپ انہیں سوٹ پہنے دیکھیں گے تو دل کے اُوپر گلاب لگا ہوا آپکو ضرور دکھائی دیگا۔ اور اگر کوٹ نہ ہو اور گلاب مل جائے تو اپنی کار کے اسٹیرنگ ہی میں لگا لیں گے۔

جمیل صاحب کی خوش اخلاقی بعض صورتوں میں اس حد کو پہونچ جاتی ہے کہ لوگ انہیں شک کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں، خصوصاً خواتین کے باب میں۔ میں نے بھی چند بار ان کے التفاتِ فراواں کو دیکھا ہے اور اِس پر انہیں ٹوکا بھی ہے، مگر جمیل صاحب نے گھبرا کر نہایت سادگی سے جواب دیدیا کہ "نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔" مگر بدبینوں یا بدطینتوں کا کیا کیجئے؟ مارتے کا ہاتھ تو پکڑا جا سکتا ہے، کہتے کی زبان نہیں پکڑی جاتی۔ جو لوگ جمیل صاحب کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں سمجھتے ہیں کہ عورت جمیل صاحب کی کمزوری ہے، اور واقع میں جب کسی خاتون سے سابقہ پڑتا ہے تو اُس سے اِس قدر گھُل مل کر باتیں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے رشتہ خطمی ہو گئے۔ لیکن دراصل یہ اُنکا حُسنِ اخلاق ہوتا ہے اِن کا جذبۂ احترام ہوتا ہے۔ اور تو اور مُتعارف ہونیوالی خاتون کو بھی مُغالطہ ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ جمیل صاحب کی پوزیشن بڑی آکورڈ ہو جاتی ہے (یہ فقرہ میں نے آجکل کی اُردو میں لکھا ہے۔) دراصل کسی غیر خاتون سے بات کرنا سانپ کا کھِلانا ہوتا ہے۔ شیکسپیر کہہ گیا ہے "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے۔" خدا جانے اُس کی یہ کمزوری کب عود کر آئے۔ چنانچہ عود کر آئی، اور یہ واقعہ جمیل صاحب نے خود سُنایا کہ گلڈ کے سالانہ اجلاس کے سلسلے میں جو چند خواتین مشرقی پاکستان گئی تھیں اُن میں سے ایک بیاہی تیاہی خاتون نے اٹھلا کر

ان پر مُنہ مارا مگر یہ حُسنِ اتفاق سے بچ گئے اور اُسے اُلٹی مُنہ کی کھانی پڑی۔ ہوا یہ کہ گلڈ کے اجلاس ختم ہو جانے کے بعد مہمانوں کی ٹولیاں بنا کر مشرقی پاکستان کی سیر کرائی گئی اور چونکہ جمیل صاحب گلڈ کے ایک نہایت ذمّہ دار رُکن ہیں بلکہ گلڈ کے بنانے والوں میں سے ہیں اس لئے انہیں چند اور ادیبوں کے ساتھ خواتین کی ٹولی میں شریک کر دیا گیا۔ ریل کسی نہایت خوش منظر علاقے سے گزر رہی تھی، جمیل صاحب نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ایک خاتون سے کہا۔ "دیکھیے کتنا خوشنما منظر ہے۔" خاتون نے گھوم کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور ایکدم سے پلٹ کر کہا "ہوں، تو آپ میری کمر دیکھنا چاہتے تھے!" یہ جملہ اس قدر اچانک ہوا کہ جمیل صاحب بھونچکے ہو کر رہ گئے۔ اور جمیل صاحب ہی کیا سارے ہمسفر عورت مرد ہکّا بکّا رہ گئے۔ جمیل صاحب کا چہرہ غصّے سے تمتما گیا، اگر مقابل کوئی مرد ہوتا تو یقیناً مارتے مارتے وہ اس کا بھرکس نکال دیتے۔ جن لوگوں نے یہ سین دیکھا تھا تہایا کہ جمیل خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا اور بڑی بُردباری سے بولا "آپ کی کمر میں کیا رکھا ہے جو میں اِسے دیکھوں؟" زخمی سانپن نے پھر پھن مارا "آپ لوگ اپنی بیویوں کو ساتھ کیوں نہیں لاتے؟" جمیل نے کہا: "جب آپ اپنے شوہروں کو ساتھ نہیں لاتیں تو ہمیں اپنی بیویوں کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت ہے؟" اس پر سب کی طرف سے ایک مِلا جُلا قہقہہ پڑا اور بات ہنسی میں اُڑ گئی۔ مگر جمیل صاحب کی کھلنساہٹ دیکھیے کہ اِس واقعہ کے بعد بھی انہوں نے اُن محترمہ کے ساتھ اپنے شائستہ روّیہ میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ دراصل جس شخص کو اپنے بیوی بچّوں سے محبت ہوتی ہے وہ ڈھونڈتا نہیں پھرتا۔

اسکول کے زمانے میں کسی انگریزی نظم میں پڑھا تھا کہ ایک ماں اپنے بچّے کو یوں نصیحت کر رہی ہے۔ "بیٹا، اگر دُنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو "نہیں" کہنا سیکھو۔" اس کا مجھے بار بار تجربہ ہوتا رہا ہے، اور آپ کو بھی تجربہ ہوا ہوگا کہ "نہیں" کہنا کسقدر مشکل ہے اور "ہاں" کہنا کس قدر آسان۔ جمیل صاحب "نہیں" "نہیں کہہ سکتے۔ انکے پاس

بیسیوں ضرورت مند آتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو نفی میں جواب نہیں دیتے اور کبھی کسی کا کام کرنے سے انکار نہیں کرتے۔ بہت سوں کا کام اپنی خلافِ مرضی بھی کر دیتے ہیں، بعد میں اس پر متاسف بھی ہوتے ہیں مگر اُس کا کام کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کام ان کے بس کا نہیں ہوتا مگر اُس سے آخر تک ہاں ہاں کئے جاتے ہیں، اور جب کام نہ ہونے پر اگلا آگ بگولا ہوتا ہے تو جی ہاں جی ہاں کہہ کر اُس کی کڑوی کسیلی بھی گوارہ کر لیتے۔ میں نے اُنکے اس رویہ پر اُنہیں اکثر ٹوکا ہے مگر اُن کی اِس ادا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لہذا مجھے ان کی "ہاں" مشتبہ نظر آنے لگی۔ سچ ہے شوم بھلا جو تُرت دے جواب۔

جمیل صاحب بڑے خلوص سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اور جب اُن سے باز پُرس کی جاتی ہے تو بڑی محبت سے کوئی خوبصورت عُذر تراش لیتے ہیں اور اُن کے اِس بھولپن پر غصّے کے بدلے پیار آجاتا ہے۔ وہ وعدہ کر لیں گے کہ میں کل ٹھیک پانچ بجے آپ کے پاس آؤں گا، مگر اگلے دن وہ سرے سے آتے کے ہی نہیں۔

"اماں کل کہاں رہ گئے تھے؟"

"کیا بتاؤں شاہد بھائی ـــ سوتا رہ گیا۔ بیوی سے کہا تھا جگا دینا، وہ بھول گئیں۔"

ع ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

"بھئی سب انتظار ہی کرتے رہے، آپ کھانے پر تشریف ہی نہیں لائے؟"

"ارے! بالکل بھول گیا۔ بس دیکھئے یہ حال ہوتا جا رہا ہے حافظ کا۔"

ع اِس سادگی پہ، کون نہ مر جائے اے خدا؟

جمیل صاحب وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ لیٹ ہونا اُن کا معمول ہے، چنانچہ اب میں اُن کے لئے اتنا مارجن رکھتا ہوں۔ اگر مجھے اور اُنہیں ساتھ جانا ہوتا ہے تو وہ نہایت وثوق سے کہتے ہیں "میں آجاؤں گا آپ کے پاس"۔ میں عرض کرتا ہوں "جی نہیں، میں آؤں گا آپ کے پاس"۔ میں وقتِ مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے انکے

گھر پہونچتا ہوں، بجلی کی گھنٹی کا بٹن دباتا ہوں۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آتے ہیں اور بیٹھک کا دروازہ کھولتے ہیں۔ "آیئے، بس ایک منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں"۔ پندرہ منٹ کے بعد برآمد ہو کر کہتے ہیں" ایک پیالی چائے کی پی لیں، بس چلتے ہیں"۔ الیکٹرک ریزر ہاتھ میں لئے چلے آتے ہیں: "یہیں شیو بنا لوں۔ آپ اکیلے بیٹھے ہیں" کہہ کر ریزر کا پلگ لگاتے ہیں اور چہرے پر استری سی کرنے لگتے ہیں۔ "ابھی بہت دیر ہے۔ دیکھ لیجئے گا وہاں کوئی نہیں آیا ہو گا۔ لوگ وقت کی پابندی ہی نہیں کرتے"۔ میں زہرخند کے ساتھ کہتا ہوں" جی ہاں، لوگ وقت کی پابندی ہی نہیں کرتے"۔ اور خندۂ دنداں نما کے ساتھ اُنکے رخساروں پر سینکڑوں ننھے ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ شیو ختم ہو گیا، پلگ نکالا اور ریزر میز پر رکھتے ہوئے بولے" آپ بھی اسی سے شیو کیا کیجئے۔ نہ صابن نہ پانی، چاہے بستر پر لیٹے لیٹے شیو بنا لیں۔ بس ابھی آیا"۔ دس منٹ پھر گزر گئے۔ ملازم نے دو پیالیاں چائے کی ہی لا کر میز پر رکھ دیں۔ پھر سگریٹ کا ڈبہ رکھ گیا۔ بارے جمیل صاحب دُھلا ہوا جوڑا اور شارک اسکن کی دودھیا اچکن پہنے نمودار ہوئے۔ ہاتھ میں پانوں کی تھالی۔ "معاف کیجئے گا، کچھ دیر ہو گئی۔ میں نے کہا کہ جلدی سے نہا کر کپڑے بھی بدل لوں۔ ارے! آپ نے چائے نہیں پی؟ ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی؟" پیالی کو ہاتھ لگا کر "نہیں، ابھی گرم ہے۔ دیکھ لیجئے گا سب سے پہلے ہم ہی پہونچیں گے۔ پان لیجئے۔ اور یہ سگریٹ دیکھئے کیسا ہے۔ ایک صاحب ترکی سے لائے تھے۔ آیئے چلیں"۔ چلئے صاحب۔ اُن کی کار میں جا کر بیٹھے۔ اس کار کو چلا چلا کر انہوں نے اس کا بلیتھن نکال دیا ہے۔ اس کی گدیاں پھٹ گئی ہیں اور جگہ جگہ اس میں سے بدھیاں لٹکی ہوئی ہیں۔

"اماں اس گاڑی کو تو بدلو۔ یہ کیا نیستی لگا رکھی ہے تم نے؟"

"جی ہاں، بدل رہا ہوں۔ چھوٹی کار مل رہی تھی مجھے کوٹے میں۔ میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ غلطی کی۔ اب بڑی کار دو سال بعد ملے گی"۔

جب جلسہ گاہ میں پہونچے تو دیکھا کہ آدھا جلسہ ختم ہو چکا ہے۔

"کمال کر دیا اِن لوگوں نے! آج سب وقت پر آ گئے۔ اچھا یوں آ گئے ہوں گے کہ مہمانِ خصوصی غیر ملکی ہے۔ خیر آیئے یہیں بیٹھے جاتے ہیں پیچھے۔"

مگر اِن واقعات کے باوجود میں ان سے اور وہ مجھ سے نتھی ہیں۔ جس شخص کے جھوٹ تک میں خلوص ہو اُس سے بھلا میں کیسے ناراض ہو سکتا ہوں؟

جمیل صاحب اور آج کل کے "دوستوں" میں یہ فرق ہے کہ جمیل صاحب میری بُرائی نہیں سُن سکتے۔ اپنے کسی دوست کی بُرائی نہیں سُن سکتے۔ اکثر احباب ایسے ہیں جو مجھ سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص آپ کی بُرائی کر رہا تھا۔ میں کہتا ہوں "تو پھر آپ نے کیا کیا؟"

"کچھ نہیں، کیا کرتا؟"

"تو گویا آپ نے اُس کی باتوں پر صاد کر دیا؟"

لگے بغلیں جھانکنے۔ معلوم ہو گیا کہ یہ دوست کتنے پانی میں ہیں۔

حال ہی میں جمیل صاحب کے ساتھ بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

ایک بڑے افسر کے دماغ میں یہ سمائی کہ گلڈ پر قبضہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اُس نے اپنے ماتحتوں سے کہنا شروع کر دیا کہ "یہ شہاب، عالی، جالی کیا ہیں؟ کیا گلڈ اِن کی میراث ہے؟"

ہوا خواہوں نے کہا "جی حضور، ستیاناس کر رکھا ہے انہوں نے۔ اپنے باپ کی جاگیر سمجھ رکھا ہے گلڈ کو۔"

"ہم کیوں نہ چلائیں گلڈ کو؟"

"اگر ایسا ہو جائے تو سُبحان اللہ۔ گلڈ کے دن پھر جائیں گے۔"

"بس تو اب کے الیکشن لڑنے کی تیاری کی جائے۔"

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ لو صاحب پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ ایک صاحب میرے

پاس بھی تشریف لائے۔ وہ جانتے تھے کہ مجھے بھی گلڈ سے کچھ شکایتیں ہیں۔ مجلسِ عاملہ کے اجتماعوں میں وہ دیکھ چکے تھے کہ میں کس قدر بدلحاظی کے ساتھ عالی اور جالی پر اعتراضات کرتا ہوں۔ اِسی سے شاید اُنہیں غلط فہمی ہوئی۔ بولے" اِن لوگوں نے گلڈ کو مذاق بنالیا ہے۔ فلاں افسر صاحب ہماری رہنمائی فرمائیں گے اور ہمارا سارا گروپ اِن کا ساتھ دے گا۔" یہ سنکر میرا ناریل چٹخ گیا۔ میں نے کہا" دیکھو جی، گلڈ بنانے والوں کے خلاف میں ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتا۔ یہ تم نے کیا سازش پھیلائی ہے؟ رہ گئے تمہارے افسر، تو اُنھیں ادب اور ادیبوں سے کیا واسطہ؟ تمہیں شرم نہیں آتی کہ ادیب ہو کر ایک بے ادب کو گلڈ پر مُسلّط کرنا چاہتے ہو۔" وہ صاحب شرمندہ ہو کر معذرت کرتے ہوئے چلے گئے اور جا کر افسر صاحب سے سارے موتی پرو دیئے۔ اس کے بعد یہ سُننے میں آیا کہ اِن حضرات نے الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے بلکہ الیکشن میں سرے سے شریک ہی نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا کاش وہ شریک ہو جاتے تو انہیں اپنی وقعت تو معلوم ہو جاتی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں بھی اس واقعہ کو بھُول گیا۔ چند روز بعد ہوا یہ کہ ایک چھوٹی سی ادبی تقریب میں وہ افسر صاحب اور ان کے ہوا خواہ شریک ہوئے۔ جمیل صاحب بھی وہاں بلائے گئے تھے۔ خبر نہیں کس سلسلے میں میرا ذکر نکال کر افسر صاحب نے کہا" وہ اوروں کو تو کہتے ہیں کہ اس کا ادب میں کنٹری بیوشن کیا ہے، مگر خود شاہد صاحب کا کنٹری بیوشن کیا ہے؟" ماتحتوں کی تو زبانیں گلی ہوئی تھیں، بھلا کیسے بولتے۔ ایک صاحب نے سنبھیا ٹالنے کے لئے کہا" جمیل صاحب سے پوچھئے۔" جمیل صاحب ویسے تو ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں مگر اُسوقت تاؤ کھا گئے۔ بولے" جن کے مُنہ پر آنکھیں نہیں ہوتیں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" افسر صاحب نے کہا" پھر بھی۔ آخر اُن کا کارنامہ کیا ہے؟" جمیل صاحب بولے" جو لوگ اُردو پڑھ سکتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ شاہد صاحب ۳۳ سال سے ساقی شائع کر رہے ہیں۔ انہوں نے سینکڑوں ادیب بنا ڈالے۔ آج کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا

ہو جو اُن کا رہینِ منت نہ ہو۔"

"مگر خود انہوں نے کیا لکھا ہے؟"

"چالیس کے قریب تو اُنکی کتابیں اسوقت موجود ہیں۔ پانسو سے زیادہ اُنکے مضامین چھپ چکے ہیں۔ اتنی ہی چیزیں وہ ریڈیو کیلئے لکھ چکے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ریپورتاژ اور خاکہ لکھنے میں تو اُنکا جواب ہی نہیں ہے۔ اُن جیسی زبان لکھنے والا اب اور کوئی نہیں ہے۔ صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ اب آپکو معلوم ہوا اُنکا کنٹری بیوشن کیا ہے؟ اپنی ادبی خدمات اور قابلیت ہی کی وجہ سے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے ادبی اجتماعوں میں بُلائے جاتے ہیں۔ اور تو اور تھائی لینڈ اور فلپینیز میں ثقافتِ پاکستان پر لکچر دینے کیلئے پورے پاکستان سے شاہد صاحب ہی منتخب کر کے بھیجے گئے تھے۔ پورے پاکستان کے تمام زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا اور گلڈ کی خشتِ اوّل رکھنا بھی شاہد صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ آپ تو اُنکی پھٹی اچکن اور ٹوٹی جوتی دیکھتے ہیں۔ آپکو وہ لعل کیسے دکھائی دے سکتا ہے جو اس گدڑی میں چھپا ہوا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ✦ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

اجتماع بے مزہ ہو گیا۔ صاحبِ خانہ روکتے ہی رہے، جمیل صاحب اُٹھ کر چلے آئے مگر مجھ سے اس واقعہ کا ذکر جمیل صاحب نے نہیں کیا۔ دو ایک اور حضرات جو اس اجتماع میں شریک تھے انہوں نے مجھے ساری رُوداد سُنائی۔ میں نے کہا "جمیل صاحب ناحق اُس کور باطن سے اُلجھے۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور جنکے کانوں پر اور جنکی آنکھوں پر مُہریں لگی ہوئی ہیں۔" مجھے اِس واقعہ کو تفصیل سے یوں بیان کرنا پڑا کہ اس سے جمیل صاحب کے کردار کا ایک خاص پہلو اُجاگر ہوتا ہے۔

جمیل صاحب اچھے کھانے اور اچھے لباس کے شوقین ہیں۔ وجیہہ درجامہ زیب آدمی ہیں۔ ہر لباس اُنپر پھبتا ہے۔ مزاج میں نفاست ہے جو گفتگو میں شائستگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میں نے اُنکے مُنہ سے گالی کبھی نہیں سُنی۔ فحش گفتگو میں حصّہ نہیں لینگے۔ بیٹھے جھینپتے رہیں گے۔ آدمی میں آخر کوئی عیب تو ہو ورنہ فرشتے ہی کیا بُرے تھے؟ کبھی شراب نہ پیتا ہو سگریٹ تو پیئے، یہ بھی نہیں۔ ہاں پان البتہ

کھاتے ہیں، اور بہت کھاتے ہیں مگر خاص اہتمام سے۔ وہ دیسی پان تو خیر یہاں ہے ہی نہیں جو اگر ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرے تو چار ٹکڑے ہو جائے، ہاں سانچی اُس سے کچھ ملتا جلتا ہے، اسکی رگیں چھیلی جاتی ہیں۔ گھر میں خوبصورت سی چاندی کی پٹاری ہے۔ کتھا کسی خاص طریقے سے پکایا اور چھانا جاتا ہے، چونے کی تیزی کم کرنے کیلئے دہی کی آمیزش کی جاتی ہے۔ چھالیا پُرانی ڈھونڈ کر لائی جاتی ہے۔ بھابی اسے سڈول اور باریک کاٹ کر کسنے بھرے رکھتی ہیں۔ جُچ گھڑا الائچی، خوشبودار زردہ اور قوام موجود۔ جمیل صاحب بکٹّے بھر بھر کے زردہ کھاتے ہیں اور قوام چاٹتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نے جب سے منع کیا ہے کچھ کم کر دیا ہے۔ پانوں کی ڈبیا پہلے ساتھ رکھتے تھے۔ جب چاروں طرف سے اس پر یورش ہونے لگی تو ڈبیا ساتھ رکھنی چھوڑ دی۔ کراچی کے تمام اچھے تنبولیوں کی دُکانیں انہیں معلوم ہیں۔ لارنس روڈ پر ایک روپے تک کا پان انہوں نے ہمیں کھلوایا ہے۔ مگر وہ پان تھا؟ الائچی سے لیکر مشک و عنبر تک اس میں موجود تھا اور "در ورقِ طلا پیچیدہ"۔ ایک دن راہ چلتے چلتے انہیں پان کھانے کی حاجت ہوگئی۔ جو پہلا پنواڑی ملا اُس سے دو پان بنوا لئے۔ میں نے جو منہ میں رکھا تو منہ کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ میں نے گھبرا کر پان والے سے کہا "دو ایک لونگیں تو دو"۔ جمیل صاحب نے کہا "لونگ مت کھائیے۔ بہت گرم ہوتی ہے۔ ایک لونگ کھانا ایسا ہے جیسے ساٹھ بینگن کھالئے"۔ مجھے اُن کے اس بھولپن پر ہنسی چھوٹی۔ ضبط کر کے بولا "فی الحال تو میں نے ایک سو ساٹھ بینگن کھالئے"۔ بچارے خفیف ہو کر رہ گئے۔ بھولے آدمی کی ہے بڑی مشکل!

جمیل صاحب کا تذکرہ حسینوں کی زلف کی طرح دراز ہوتا چلا جا رہا ہے۔

؎ لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

بڑی محبوب شخصیت ہے جمیل صاحب کی۔ جب صورت اور سیرت دونوں میں جمال ہی جمال ہو تو کیسے مجال دُوری ہو سکتی ہے؟

اللہ جمیلٌ و یحبُ الجمال۔